پدری نظام اور تانیثیت

ڈاکٹر رغبت شمیم

Abstract:

Feminism is a dominant discourse and theory of our society. We cannot understand the feminism without patriarchy and patriarchal society. We know that in patriarchal society men hold the all positions of power. Feminist theory defines patriarchy as an unjust social system that enforces gender roles. In this research paper, I have discussed in detail about the women's exploitation and all aspects of feminism.

تانیثی تنقید کی تفہیم پدری نظام اور مرداساس سماج کی تفہیم کے بغیر ممکن نہیں ہے ۔تانیثی تھیوری سے صحیح مکالمہ قائم کرنے کے لئے پدری نظام اور مرداساس سماج کا مطالعہ ازحد ضروری ہے۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں، تانیثی تھیوری سے پدری نظام کا ازلی رشتہ ہے اور تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ روزِ اول سے ہی مرداساس سماج اور پدری نظام کو زر، زن اور زمین پر غلبہ حاصل رہا ہے۔سوزان سونتاگ کی یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ دنیا کی زیادہ تر تاریخ 'پدری نظام کی تاریخ' ہے۔ضرورت ہے کہ پہلے پدری نظام کے تصورات ،مضمرات و ممکنات کا جائزہ لیا جائے۔

اینگلز نے اپنی کتاب ''خاندان، جائیداد اور ریاست کی بنیادیں'' میں پدری نظام کو خاندان کی ایک صورت قرار دیا ہے جس کی بنیادی خصائص میں یکتائی اور طاقت شامل ہے اور یہ طاقت اور یکتائی خاندان کے پدری سرپرست کے پاس ہوتی ہے۔'' ٹھیک اسی طرح مارکس اور اینگلز بھی نے کمیونسٹ مینی فسٹو میں مرد کو پدری مالک کے بطور پیش کیا ہے۔دراصل پدری نظام کو گھریلو پیداوار کے سماجی رشتے کے طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ بیشتر تانیثی ناقدین اور نظریہ سازوں نے پدری نظام کی نہ صرف بیخ کنی ہے بلکہ اس کی بنیاد کو Subvert کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ریڈیکل فیمی نزم' کے نمائندہ نقاد کاٹے ملیٹ نے اپنی کتاب 'جنسی سیاست' میں معاصر فیمی نزم کی بحث کو آگے بڑھانے کی کوشش کی اور اس میں پدری نظام کے مضمرات و ممکنات کو واضح الفاظ میں بیان کیا ہے اور

اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ پدری نظام کس طرح عورتوں کا استحصال کیا ہے ۔کاٹے ملیٹ نے اپنی کتاب 'جنسی سیاست' میں بالخصوص میکس ویبر کے تصور 'Herrschaft' سے استفادہ کیا ہے۔ یہ بات بھی خاطر نشان رہے کہ پدری نظام کی تفہیم کے لیے dominance اور subordination کے رشتے کی تفہیم بھی لازمی ہے۔کاٹے ملیٹ لکھتی ہے کہ" پدری نظام میں مرد کا عورت پر اور جوان کا بوڑھے پر غلبہ ہوتا ہے۔پدری طاقت دراصل جنس اور عمر سے مخصوص ہے۔'' نمائندہ مارکسی انقلابی شُو لامتھ فائر اسٹون نے اپنی کتاب 'جنس کی جدلیات' میں لکھا ہے کہ سماج میں عورت اور مر کے مابین تفریق دراصل 'طاقت کی sexual imbalance کے باعث ہے۔سلویہ ویلوی نے اپنی کتاب میں 'پدری نظام کی نظریہ سازی' میں لکھا ہے کہ پدری نظام دراصل ایک طرف سماجی ساخت اور عمل کا نظام ہے جس میں مرد حاوی ہوتا ہے دوسری طرف یہ عورتوں کا استحصال کرتا ہے۔مارکسی ناقدین McDonough اور Harisson نے بھی اپنی کتاب 'پدری نظام اور پیداواری رشتے' میں لکھتے ہیں کہ یہ پدری نظام کا دہرا تصور ہے کہ یہ ایک طرف عورتوں کی افزائشِ نسل اور جنسیت پر کنٹرل کرتا ہے اور دوسری طرف monogamous marriage پر بھی ۔اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ پدری نظام عورتوں پر جائداد کی طرح غلبہ رکھتا ہے اور جس طرح سے چاہتا ہے اس کا استعمال کرتا ہے ۔

معاصر فلسفی اور نظریہ ساز میشل فوکو نے موجودہ دور کو 'نالج اور پاور گیم' کا دور کہا ہے لیکن بغور دیکھا جائے تو 'پاور گیم' مرداساس سماج اور پدری نظام میں ابتدا سے ہی موجود رہا ہے ۔یہ الگ سی بات ہے کہ آج اس کی نوعیت مختلف ہے اور میشل فوکو نے اس کا اطلاق موجودہ دور کی صورتِ حال پر کیا۔بہرحال یہ 'پاور گیم' ہی ہے جو عورتوں (زن)پر مرداساس سماج اور پدری نظام کے تفوق (hegemony) کو قائم رکھتا ہے۔مرداساس سماج نے عورتوں کو محض ایک کموڈیٹی کے طور پر پیش کیا اور انھیں اپنی جنسی خواہش کی تکمیل اور افزائشِ نسل کی مشین کے سوا کوئی اہمیت نہیں دی ۔اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ ایک زمانے تک عورتوں کی شناخت 'جسمِ محض' تک مرکوز ومحدود تھی ۔'اسسے باہر ان کی اپنی کوئی حیثیت یا پہچان نہیں تھی ۔نسائی تحریک نے جب عورتوں کے حقوق کی بات کی تو مرداساس سماج اور پدری نظام نے اس ضمن میں نہ صرف غلط تعبیرات پیش کیے بلکہ یہ بھی کہا کہ عورتیں جسمانی اعتبار سے کمزور ہوتی ہیں لہٰذا ان کو مردوں کے مساوی حقوق نہیں دیے جاسکتے ہیں۔یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ عورت اور مرد کے مابین بائیولوجیکل تفریق پائی جاتی ہے لیکن اس بات سے بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ عورت اور مرد میں اذہان کی سطح پر کوئی تفریق نہیں پائی جاتی ہے ۔یہ بات نشان خاطر رہے کہ ان کی ذہانت،اہلیت اور نا اہلیت کی شناخت سماجی اور ثقافتی رویوں سے طے ہوتی ہے،جسم سے نہیں۔کوئی فرد عورت ہے یا مرد،یہ تو فطرت کا عطیہ ہے لیکن ان کی 'صنفی تشخص' (Gender Identity) کی تعیر میں ثقافتی تفاعل ہی اہم کردار عطا کرتا ہے۔عورت کی شناخت پیدائشی نہیں بلکہ سماجی اور ثقافتی ہوتی ہے۔سیمون دی بوار نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'دوسری جنس' میں لکھا ہے کہ" 'عورتیں دراصل اپنی اصلی حالت میں سماج میں پیدا نہیں ہوتیں بلکہ مرداساس سماج انھیں عورت بننے پر مجبور کرتا ہے۔'' سیمون دی بوار نے جدید سماج میں عورتوں کے حالات اور

مسائل کا تخمینہ تمام علوم یعنی تاریخ، فلسفہ، اقتصادیات، بائیلوجی اور ادب وغیرہ کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ عورت کو مرداساس سماج نے ہمیشہ 'دیگر' یا 'دوسری جنس' کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور ان کی شناخت میں مرداساس سماج اور پدری نظام کے دخل کو ہی کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔ عورتوں کی اپنی کوئی جداگانہ پہچان نہیں رہی اور ان کی پہچان میں لفظ فلاں کی بیٹی، بیوی، بہن، بہو، رکھیل وغیرہ کو ہی تفوق حاصل رہا ہے۔ یہ معاملہ محض سماجی زندگی میں ہی درپیش نہیں رہا ہے، ادب، فن، کلچر وغیرہ میں بھی ان کی شبیہ کو مناسب ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس بات سے کون واقف نہیں ہے کہ مرداساس سماج نے عورتوں کو ہمیشہ حاشیے پر جگہ دی۔ پدری نظام کے پروردہ ادیبوں نے بھی اپنی تخلیقات میں عورتوں بطور اسطوری خلق کیا ہے۔ تانیثیت سے قبل عورت کی اصل شبیہ کہیں بھی واضح طور پر ادب میں دیکھنے نہیں ملتا۔ دنیا کے ہر ادب نے عورتوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا ہے۔ اردو ادب بھی اس برتاؤ سے مبرا نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عورتوں جیسے کوئی سوچی سمجھی سازش رہی ہے۔ بغور دیکھا جائے تو مرداساس اور پدری نظام کا تفوق سماج کی بنیادی ساخت ہو یا بالائی ساخت ہر جگہ قائم و دائم رہا ہے۔ ظلم و جور جب حد سے بڑھ گیا تو عورتوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ عورتوں کی یہی صدائے احتجاج نسائی تحریک بن گئی۔ نسائی تحریک نے اپنی کوشش سے نہ صرف مرداساس سماج مروجہ عمات کو subvert کرنے کی کوشش کی بلکہ عورتوں کی گھریلو زندگی کے حقائق کو سماجی حقائق کے بطور پیش کیا اور یہ بھی اعلان کیا کہ عورتوں کی بھی اپنی سماجی اور ثقافتی حیثیت ہوتی ہے، عورتیں 'جسم محض' نہیں اور نہ ہی کوئی جنسی کموڈیٹی ہیں کہ مرد جس طرح چاہے اس کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔ عورتوں کی بھی اپنی خواہشات اور ضرورتیں ہیں۔ سماج میں انھیں بھی اپنی مرضی کے مطابق جینے کا حق ملنا چاہیے۔ انھیں بھی مردوں کے مساوی سماجی زندگی میں سارے حقوق دی جانی چاہیے۔ ہیلن سکساؤس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ عورت، مرد کے مقابلے میں ثقافتی اور معاشی نظام سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ دلیل بھی پیش کی کہ یہ دراصل اپنے بنیادی ڈھانچے کی بازیافت بہ آسانی کر لیتی ہے۔ عورتیں دنیاوی تعلقات کے معاملے میں بھی مرد کے مقابلے میں مہارت رکھتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ نسائی زبان اور موضوع کے مابین رشتے کو مستحکم کرتی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ پدری نظام اور سرمایہ دارانہ ریاست کو چیلنج دیے بغیر انقلاب ناممکن ہے۔ ہیلن سکساؤس نے عورتوں سے اعلانیہ طور پر کہا کہ ہمیں سماج میں بولنا چاہیے۔ ہمیں یہ بالکل نہیں کہنا چاہیے کہ وہ کچھ کہنا نہیں چاہتی ہیں۔ عورتوں کو صرف سامعین نہیں، مقرر بھی بننا چاہیے۔ ہمیں اپنے اندر بولنے کی ہمت پیدا کرنی چاہیے۔ عورتوں کو لکھنا چاہیے اور اس سے یہ اعلان بھی کرنا چاہیے کہ جنسی تضاد اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ عورت کو عورت کے طور پر نہیں ادیبہ کے طور پر لکھنا چاہیے۔ ہمیں لکھتے وقت محتاط بھی رہنا چاہیے۔ ہمیں نام و نمود کے گرداب میں نہیں پھنسنا چاہیے۔ تحریر کسی عورت کی ہو یہ ضروری بھی نہیں کہ وہ عورتوں کی حمایت میں ہی لکھی گئی ہو۔ تانیثیت کے موضوع پر مرد کے لکھے ہوئے مضمون کو بھی یکسر منہا نہیں کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی نسائی پہلو کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہو۔ ہیلن سکساؤس اپنی تانیثی تنقید میں عورت اور مرد دونوں کی تحریروں کو اہمیت دیتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہیلن سکساؤس یہ بھی کہتی ہے کہ ہمیں اپنی تحریروں میں عورتوں کو ہی

مرکزی حیثیت دینی چاہیے کیوں کہ ان کو تعصب کی بنیاد پر منہا کیا گیا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں عورتوں کی قرأت کو مرکز میں لانا چاہیے۔اس کی زندگی،اس کی تاریخ اور اس کی تحریک کو متون کا حصہ بنانا چاہیے۔وہ بھی کہتی ہے کہ عورتوں کی موجودہ صورتِ حال کو بدلنا ہوگا لیکن اس کو بدلنے کے لئے ہمیں بار بار ماضی کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے کیوں کہ اب مستقبل کا فیصلہ ماضی سے نہیں ہوسکتا ہے۔انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں ماضی کی اہمیت اور عظمت کا پورے طور پر منکر نہیں ہوں۔البتہ میں اس بات کو تسلیم کرتی ہوں کہ ماضی کی اپنی اہمیت اور معنویت ہے اور یہ اہمیت آج بھی اپنی جگہ قائم و دائم ہے تاہم میں اس کے استحکام اور دوہرانے کے عمل سے گریز کرتی ہوں۔ہیلن سکساؤس کے اس بات سے پروفیسر قدوس جاوید بھی متفق نظر آتے ہیں:

> ''اس بات سے انکار نہیں کہ تانیثیت اور تانیثی تنقید کے مرکز میں عورت ہی ہوتی ہے لیکن تانیثی ادب یا تنقید شرطیہ طور پر عورت کا ہی لکھا ہوا یہ تصور غلط ہے۔''
>
> (اردو دنیا،قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو،نئی دہلی،اکتوبر 2015،ص 32)

پدری نظام کا عورتوں کے جسم و دماغ دونوں پر غلبہ رہا ہے۔عورتیں اپنے دماغ نہ سوچ سکتی تھی اور نہ اپنے احساسات و جذبات کا اظہار اپنی زبان سے کرسکتی تھی۔یہ سلسلہ ایک زمانہ دراز تک جاری رہا۔عورتوں کو بولنے کے لئے مرد اساس سماج کا سہارا لینا پڑتا تھا۔اپنے نام سے لکھنا اس زمانے میں معیوب سمجھا جاتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ پدری نظام میں عورتوں کی سوچ بھی پدری رہی اور وہ خود بھی اپنی سوچ کو مرد اساس سماج کی سوچ میں ڈھالنے کی کوشش کرتی رہی۔حتیٰ کہ ابتدائی دور میں عورتوں نے اپنے نام سے بھی نہیں لکھا ہے۔انھوں نے ہمیشہ مرد نام سے لکھا ہے یا اپنے پدر کی نسبت یعنی بنت آدم کے ناموں سے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ان کی زندگی کے گزارنے کا طریقہ بھی مرد اساس سماج کا ہی زائیدہ رہا ہے۔انھوں نے کبھی بھی اپنی خواہشات کو مرد کے سامنے ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی۔مرد نے جو دے دیا یا جو کہہ دیا اسی کو من و عن قبول کرلیا۔ابوالکلام قاسمی اپنے مضمون میں ان جہتوں کو بار بار اجالنے کی کوشش کی۔لکھتے ہیں:

> ''ایک پدرانہ معاشرے میں عموماً ایک عورت بھی مرد کے نقطۂ نظر سے نہ صرف زندگی گزارتی ہے بلکہ اس کے سوچنے کا انداز بھی مرد اساس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔اس صورتِ حال میں عورت کے لئے بھی اپنے اندر مردوں کے قائم کردہ تصوراتِ زن سے نجات حاصل کرنا اور ان کے متن میں ان عناصر کی نشان دہی کرنا طبقۂ اناث کی فطری سوچ پر مبنی ہو۔پورے نظامِ فکر اور رائج زاویہ نظر کی تبدیلی کا متقاضی ہے۔(تانیثیت کے بنیادی مسائل)

تانیثیت میں جنسی تشخص اور شناخت کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ہیلن سکساؤس نے واضح لفظوں میں لکھا ہے کہ عورتوں کو خود اپنی تحریروں میں اپنے جسم کے بارے میں لکھنا چاہیے۔ورجنیا وولف نے بھی لکھا کہ عورتوں کو اپنے جسم کی پکار کو پیش کرنا چاہیے۔ہیلن سکساؤس نے کہا کہ عورتوں کو لاشعوری طور پر ہی سہی،خود اپنے بارے میں لکھنا چاہیے۔اپنے جسم کی پکار کو سننا چاہیے۔عورتوں لاشعوری بہاؤ کی زیادہ سے زیادہ کیفیت موجود ہے اور عورتوں کا

تخیل بھی لامحدود اور حسین ہوتا ہے۔ایک جینوین عورت لکھاری جب اپنے وجو کو پیش کرتی ہے۔تو دراصل وہ اپنے احساسات اور جذبات کو پیش کر رہی ہوتی ہے۔

سیمون دی بوار نے عورتوں کی دنیا کو بدلنے میں کوشاں تھیں۔انھوں نے عورتوں کی اپنی پہچان کی جانب خاص توجہ دی ہے اور سماج میں ان کے مساوی حقوق کی بات کو بڑی بے باکی سے پیش کیا ہے۔انھوں نے اپنے مطالعے کی بنیاد پہ یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عورتوں کو مردوں کے برابر اس وقت حقوق نہیں مل سکتا، جب تک کہ وہ خود اپنی جنسی آزادی کے تشخص کو بحال نہیں کرتی ہے۔تانیثیت نے ادب کی رویت میں آفاقی اصولوں کے تصور، جاگیردارانہ مسلمات کی قطعیت، غالب سماجی اداروں کی اجارہ داری، پدرانہ نظام پہ قائم سماجی تصورات اور جنسی تفریق پہ خاص توجہ دیتی ہے۔اس نے لسانی، ثقافتی اور جنسی اکائیوں کی طرف سے روایتی طور پہ تسلیم شدہ اصول ومعیار پہ اصرار بڑھ گیا ہے۔تانیثیت میں اپنی شناخت کا مسئلہ بنیادی مسئلہ اہمیت رکھتا ہے۔

ہندوستانی معاشرت میں پدری نظام کی بالا دستی قائم رہی ہے لیکن اس کی نوعیت مغرب سے مختلف ہے۔مغرب میں پدری نظام کا غلبہ پوری طرح قائم تھا یہی وجہ ہے کہ نسائی تحریک کی پہلی آواز بھی وہیں سے بلند ہوئی۔لیکن ہندوستانی معاشرت میں اس کی نوعیت اس لئے جدا ہے کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور مختلف کلچر کی آمیزش ملتی ہے۔زبان اور دوسری سطح پہ بھی یہاں یکسانیت نہیں پائی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہاں تانیثی فکریات کو یکساں طور قبول کرنا ممکن نہیں ہے۔ابوالکلام قاسمی نے عورتوں اور عورتوں کے مابین طبقاتی کش مکش کو بھی اپنے مضمون میں نشان زد کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ عورتوں پہ جور وستم محض مرد ہی نہیں کرتے ہیں، عورتیں بھی عورتوں پہ ظلم وستم کرتی ہیں۔اس میں سفید اور سیاہ کی طبقاتی کش مکش کو بطور مثال دیکھا جا سکتا ہے۔مارگریٹ والٹرس اپنی کتاب 'تانیثیت: ایک مختصر تعارف' میں اس جانب واضح طور پہ اشارہ کیا ہے۔لکھتی ہیں:

> White middle -class women often seem to be dictating a feminism that concentrates on gender discrimination ,while tending to overlook, for example ,the class differences and racial discrimination that complicate ideas about gender .Brazilan women have argued that feminism is "eurocentric",that it has nothing to say to them about urgent local problems :racial violence and health issues ,as well as the difficulties black women may encounter when looking for work .Indeed some Latin American women actually reject the word feminism."

(p117-118,Feminism:A short Introduction by Margaret Walters)

تانیثی نقاد عورتوں کے مابین فرق کی سخت مذمت کی ہے ان کا کہنا ہے کہ عورت عورت ہوتی ہے۔اس میں عام اور خاص کی تفریق فضول بات ہے اور ہر عورت کی اپنی ترجیحات اور اپنا خدوخال ہے۔اس لیے عورت کو جنس، مساوات، یکسانیت یا کسی بھی مخصوص زمرے میں دیکھنا اپنے آپ میں ناانصافی ہے۔لیکن ہیلن سکساؤس اس بات اتفاق ممکن نہیں ہے۔ہندوستان میں محض عورتوں کے مسائل ہی اہم نہیں ہیں۔ہندوستانی سماج میں سبالٹرن ،دلت اور آدی باشی کے مسائل بھی قابلِ غور ہیں۔سرمایہ دارانہ نظام میں ان کے ساتھ بھی یکساں سلوک نہیں کیا جاتا ہے۔اس کی اصل وجہ طبقاتی کشمکش ہے اور طبقاتی کش مکش کی بنیاد دولت کی نابرابری ہے۔ابوالکلام قاسمی کا یہ کہنا کہ ''ہمارے معاشرتی نظام کے زیر اثر ادب میں بھی پدری نظام کی بالا دستی شعوری سے کہیں زیادہ تحت الشعوری گہرائیوں میں پیوست ہے'،اپنی جگہ درست ہے۔ادب میں بھی پدری نظام کی سائیکی کو بخوبی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ ادب انسانی زندگی اور سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔شعور،تحت الشعور اور لاشعور سب انسانی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔لہٰذا یک ادیب کے ادب میں ان کی سائیکی کا در آنا کوئی حیران کن بات ہے۔کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پدری نظام کے پروردہ ادیبوں کے ادب میں عورتوں پر مردوں کو ہی تفوق حاصل ہے۔یہ تفوق شعور سے زیادہ تحت الشعور کا حصہ نظر آتا ہے۔

تانیثی تنقید کو ایک خاص قسم کا سیاسی ڈسکورس بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہ پدریت اور جنسیت کے خلاف نبرد آزما ہے۔بعض لوگ تانیثیت یا تانیثی تنقید کو جنس سے جوڑ کر دیکھتے ہیں لیکن ادب میں اس کا سروکار محض جنس سے نہیں ہے۔اس کا دائرہ نہایت وبسیط ہے اس میں عورتوں کے سماجی معاشی،سیاسی اور ثقافتی مسائل کو بھی دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اردو میں تانیثیت کو تحریک یا رجحان کے بطور دیکھنے اور پڑھنے کا رجحان زیادہ ملتا ہے۔تانیثیت کی تحریکی یا رجحانی اہمیت سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن ادبی تنقید میں تحریک یا رجحان پر زور دینے کی بجائے قرأت کی معنویت کو اجالنے کی زیادہ ضرورت ہے۔دراصل طرزِ قرأت سے ہی متن میں نئے نئے مفاہیم پیدا ہوتے ہیں۔چونکہ قاری متن کی محض قرأت نہیں کرتا ،وہ اس سے مکالمہ بھی قائم کرتا ہے۔دراصل متن میں معنی مکالمہ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ہر قاری اپنی قرأت سے متن میں پوشیدہ اور غیر واضح مفاہیم کو اخذ کرتا ہے اور متن کی تفہیم کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔اس لئے متن کی تفہیم وتنقید میں طرزِ قرأت یا اندازِ مطالعہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ابوالکلام قاسمی اردو کا پہلا ناقد ہے جس نے تانیثیت کی تفہیم میں طرزِ قرأت یا اندازِ مطالعہ کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ'' تانیثیت کے بنیادی مقدمات کی تفہیم کا حق صرف اسی طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ ہم اسے کسی تحریک یا رجحان سے زیادہ ایک طرزِ قرأت یا اندازِ مطالعہ سے تعبیر کرنے کی کوشش کریں۔''اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ادبی تنقید میں طرزِ قرأت یا اندازِ مطالعہ کی اپنی معنویت اور اہمیت ہے۔دراصل متن کی ہر قرأت ہمیں ایک نئے طلسمِ معنی سے ہمکنار کرتی ہے۔انھوں نے تانیثی متون کی تفہیم میں ادبی،لسانی،ثقافتی اور معاشرتی جہات کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔پدری نظام کے نظریہ کے سبب ہی عورت کو دائم درجے کا مقام ملا۔جائیداد،

تعلیم، حکومت، سیاسی حقوق اور سماجی حقوق سے عورت کو محروم ہونا پڑا۔طویل جدوجہد کے بعد عورتوں کو تعلیم اور جائیداد کے میدان میں مساوی حقوق ملے ہیں۔لہٰذا پدری نظام کی قدروں کا سماجی تفوق پوری طرح سے ابھی ٹوٹا نہیں ہے۔فوج، سرکار، صنعت، ٹکنالوجی، سائنس، سیاست، دفتر، یونیورسٹیوں، عدالتوں، پولیس میں ابھی بھی مکمل حقوق مردوں کے ہاتھوں میں ہے۔

ورجنیا وولف کو تانیثیت میں نقش اول کی حیثیت حاصل ہے۔اس نے سب سے پہلے پدری نظام کے خلاف لکھا۔اس کے جوروستم کے خلاف لکھا۔اس ضمن میں ان کی کتاب'Three Guinea(1938)' کو حوالے کے طور پر پیش کیا ہے۔انھوں نے ورجینا وولف کو پدری نظام کے خلاف آواز بلند کرنے والی خاتون تسلیم کیا ہے۔اس ضمن میں ان کی کتاب'Three Guinea(1938)' کو بھی حوالے کے طور پر پیش کیا ہے۔سونتاگ نے اپنی تحریروں میں تانیثی اقدار کو بطورِ خاص پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جنسی تشخص کی اہمیت کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی۔سونتاگ نے پوری کوشش کی کہ پدری نظام کا خاتمہ ہو جائے۔لیکن وہ بھی مارکس کی طبقاتی کشمکش کی طرح پدری نظام کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ابوالکلا قاسمی نے اپنے مضامین میں سونتاگ کے نظریۂ فکر سے حتیٰ الامکان استفادہ کیا ہے۔ان کے مضامین میں بالخصوص ان کے مضمون'تیسری دنیا کی عورتیں' کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

ابتدائی دور میں تمام تحریکات و رجحانات ریڈیکل ہوتے ہیں۔انتہا پسندی دراصل ایک فطری چیز ہے۔میرا خیال ہے کہ ابتدائی دور میں تحریکات و رجحانات کو ریڈیکل اور انتہا پسند ہونا بھی چاہیے۔کیونکہ تحریکات و رجحانات کو اس سے فروغ ملتا ہے اور اس کے بعض گوشے مزید روشن ہوتے ہیں۔سوزان سونتاگ نے تحلیلِ نفسی کی مدد سے تانیثی ادب کو پرکھنے کی بہترین کوشش کی۔انھوں نے اطالوی ناول نگار اینا بانٹی (Anna Banti) کی تحریروں کا مطالعہ تحلیل نفسی تجزیہ پیش کیا۔اینا بانٹی کے بارے ہم جانتے ہیں کہ وہ لفظ فیمی نزم سے کافی متنفر تھیں۔تاہم سوازان سونتاگ نے اپنے تجزیہ سے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اینا بانٹی فیمی نزم سے ضرور ناپسند کرتی تھی لیکن انھوں نے اپنی تخلیقات میں عورتوں اور عورتوں کے مسائل کو ہی پیش کیا ہے۔سوزان سونتاگ نے کہا کہ اینا بانٹی خود کو فیمی نسٹ نہیں مانتی تھی تاہم ان کو ان کی تحریروں کی بنیاد پر فیمی نسٹ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔سوزان سونتاگ نے پدری نظام کی سخت تنقید کی ہے اور اس سے فاشسٹ نظام کے نام سے موسوم کیا ہے۔انھوں نے دوٹوک لفظوں میں کہا ہے کہ دنیا کی زیادہ تر تاریخ 'پدری نظام کی تاریخ' ہے۔سوزان سونتاگ نے پدری نظام کو ختم کرنے میں انتہا پسندی کی حد تک کوشاں رہی ہے تاہم وہ بھی مارکس کی طبقاتی کش مکش کی طرح پدری نظام کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔تانیثی تنقید میں ان کے مضمون'تیسری دنیا کی عورتیں'(The Third world Women) سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس میں انھوں نے تیسری دنیا کی تانیثی حقائق کو واضح طور پر پیش کیا ہے۔

مغرب میں عورتیں پس ماندگی کو اپنا مقدر نہیں سمجھتی ہیں۔یہاں کی عورتوں نے اپنی پس ماندگی کے اسباب و عوامل کو جاننے کی کوشش کی۔انھوں نے ہر اس نظریہ کی تردید کی ہیں جو عورتوں کی مخالفت کرتا ہے۔وہ چاہے فرائیڈ کا

نظریۂ ترجیح ہو یا مارکس کا نظریۂ طبقاتی کش مکش۔اس بات سے کون واقف نہیں ہے کہ مارکس اور لینن نے بھی عورتوں کی حمایت میں واضح طور پر کچھ نہیں لکھا ہے۔اینگلز اس ضمن میں البتہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا میں محنت کی پہلی تقسیم دراصل شوہر اور بیوی کی نسل انسانی کی افزائش سے ہوتا ہے۔انھوں نے کہا کہ نسل انسانی کی افزائش میں دونوں کی محنت شامل ہوتی ہے تاہم اس میں مرخود کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔اینگلز کہتا ہے کہ مرد اساس سماج کا تفوق(Hegemony)دراصل یہیں سے شروع ہوتا ہے۔مغرب میں عورتیں زیادہ دورس اور روشن خیال ہوتی ہیں۔ابوالکلام قاسمی مشرقی عورتوں کی ذہنی پس ماندگی کے المیہ کو بھی پیش کیا ہے۔

تانیثی تھیوری ابتدا سے اب تک دانشوری بلندی سے نہایت قریب رہی ہے۔تانیثی متون کے مطالعے میں سیاسی ضروریات اور تجربات کو ہی پیش نظر رکھا گیا ہے۔عورتیں اب اپنے سبجیکٹ میں اپنی عملی زندگی کو مثالی،امتیازی Introvention بنا سکتی ہے۔تانیثی تھیوری اکیڈمیا اور سماج کے مابین کے اہم رشتے کو بھی فراہم کرتی ہے۔ساتھ ہی ساتھ یہ عورتوں کے تشخص اور ان تمام سیاسی اداروں کے مسائل کو اجاگر کرتی ہے۔اس نے لزومیت اور رسومیات،تشخص کے انضمام،سیاسی طاقت کی نوعیت جیسے مجرد موضوعات کو بھی اپنے احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کرتی ہے۔دیکھا جائے تو تانیثیت لینن سے لاکاں،اور ہیوٹے سے بدن تک کا سفر طے کر چکی ہے اور اس کا دائرہ کار نشانیات، لسانیات،تحلیل نفسی،سیاسی تھیوری(مارکسیت وغیرہ)،عمرانیات ، جمالیات اور عملی تنقید کو محیط ہے۔اس کو وسعت عطا کرنے میں موئرس،ملیٹ،شوالٹر،گلبر اور گیوبر،ارے گیری،سکساؤس وغیرہ کا نام قابل ذکر ہیں۔

مختصر یہ کہ موجودہ عہد میں تانیثیت ایک دبستان کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ ملک اور بیرون ملک کی دیگر یونیورسٹیوں میں بطور مضمون شامل ہے۔کثیر تعداد میں تحقیقی اور تنقیدی کام بھی اس موضوع پر ہو رہے ہیں۔علاوہ ازیں تانیثیت کے حوالے سے نئی نئی سائٹس بنائی جا رہی ہیں۔کانفرنس اور سیمینار بھی کرائے جا رہے ہیں۔متعدد تانیثی رسائل معرض وجود میں آ رہے ہیں۔اب تانیثیت کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔اردو میں بھی تانیثیت کا دائرہ تنگ نہیں ہے۔سب سے اچھی بات یہ ہے کہ عورتیں اب کسی مرد نقاد و مورخ کی محض محتاج نہیں ہیں۔اب وہ اپنی تاریخ اور اپنا ادب خود لکھ رہی ہیں۔تنقید کے میدان میں بھی ان کی پیش رفت جاری ہے۔ان کے پاس اب اپنی زبان،اپنا ڈکشن اور اپنا ادب ہے اور وہ خود مختار حیثیت رکھتی ہیں۔ساتھ ہی ساتھ وہ تانیثی ادب کے تاریخی حقائق کو بڑی بے باکی سے رقم کر رہی ہیں اور سابقہ متون کی غلطی اور تاریخ کے غلط رویوں کو بھی نشان زد اور Deconstruct کر رہی ہیں۔